

عشقِ راجن

”آپ کو ایک قصہ سناؤں۔“
سن لیجئے۔ مختصر سا ہے۔ آپ کا کیا جائے گا۔ بس
یہ ہے کہ آپ کی سہیلی سے میرے دل کا بوجھ ہٹا
ہو جائے گا۔

ممکن ہے رستے ہوئے زخموں پر پھلپھار کھنے کی کوئی
صورت نکل سکے۔
خوشی کی صدیاں لہجوں کے برابر ہوتی ہیں مگر کرب
کے لہجوں میں انسان کو صدیاں جینی پڑتی ہیں۔ میں
صدیاں جینی رہی ہوں۔
مجھ پر رحم کھائیے، صرف تھوڑی دیر کے لیے مجھے

ناولٹ



سن لیجئے۔ میں تھکنے لگی ہوں اس بوجھ کو ڈھونڈتے
ڈھونڈتے اس کمر میں، میرے کمر میں۔ کوئی ایک بھی
ایسا فرد نہیں ہے جس سے میں اپنا غم کہہ سکوں، جسے
اپنے زخم کھا کر مسیحائی کی گزارش کر سکوں۔

”ہاں، یہ میرے کمرے کی دیواریں ہیں، جن سے
میں اپنا ہر غم کہہ چکی ہوں۔ انہوں نے میرے کرب کو
دیکھا، میری شدتوں کی بریادی پر ماتم کیا ہے، یہ میرے
راز کی شریک ہیں، میری واحد ساتھی۔ میری واحد
ساتھی مگر سچی ساتھی۔“

یہ میری کہانیاں سنتی ہیں مگر بولتی نہیں۔ یہ میرا غم
دیکھتی ہیں مگر ان کی زبان نہیں۔ یہ جانتی ہیں میرے
دل کا سکون الفاظ میں نہیں ہے مگر ان کے پاس الفاظ کی
نقدی نہیں۔ یہ بول سکتیں تو مجھے تب ہی نہ روک
لیتیں جب میری ”بریادی“ مجھے اپنے پیچھے دوڑائے
بلے جا رہی تھی۔

آپ کو پتا ہے انسان کے لیے اس سے کڑا وقت اور
کوئی نہیں ہو سکتا جب اس کے ارگرد رہنے والے
اس کے بہت پیارے بہت پسندے اس کے دل کا حال نہ
جان سکیں۔

اللہ نے انسان کو سب کچھ دیا، علم سے نوازا، عقل
دی اور پھر۔ پھر اس کے اندر دو سراہٹ کی خواہش
ڈال دی۔

انسان لاکھ رومیاں لکھا ہو، عالم فاضل ہو مگر یہ خواہش
اپنے اندر سے کبھی نہیں نکال پاتا کہ جب وہ مضطرب



ہو تو کوئی دوسرا انسان اس کے اضطراب کو اپنے الفاظ سے رفع کرے۔ جب وہ زخمی ہو تو اس کے زخموں پر کسی اور کے ہاتھ بھارے رکھیں۔
 کس الفاظ کا ہوا ہاتھ کا کر ایک بات طے ہے۔ زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر انسان کو جہاں وہ بولی سے بچانے کا جب ضرور پڑتا ہے۔

میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں آپ سے گزارش کیوں کر رہی ہوں۔ میں بھی انسان ہوں مجھے بھی لمس کی خواہش ہے میرے الفاظ میری تسلی کا سامان نہیں کہاتے میں چاہتی ہوں کہ آپ کچھ وقت کے لیے تھوڑی سی دیر کے لیے۔

اس گھر میں سب میرے اپنے ہیں سب مجھ سے محبت کرتے ہیں مگر کوئی بھی میرے غم کا شریک نہیں ہے۔ سب خود میں مگن ہیں سب خوشیاں مناتے ہیں۔ آج رات تو حویلی میں چرائیں بھی ہو گا مگر کسی کو کیا پڑی ہے کہ میرے سر پر ٹہنی ہوئی مصیبت کا دوا کرنا پڑے۔

کھانے کی میز پر بڑے ابانے کس قدر سکون سے مجھ پر لاوا آئے ہاتھ تھا۔
 ”اوحسین آ رہا ہے۔“

میری انگلیوں میں دھانوالہ پلیٹ میں گر گیا اور منہ میں موجود نوالہ حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ مجھے لگا اب میں ساری زندگی نوالہ نگل پاؤں گی نہ چلیں جھپک سکوں گی۔ مگر الفاظ بھی نوالے اور سانس کی طرح ہی اٹک کر رہ گئے اور میں کچھ بھی بول نہ سکی۔

”حسین ہمارا بچہ ہے۔ ہمارا خون۔ کب تک باراضی قائم رکھی جاسکتی ہے پھر وہ ایک مدت سے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے ہم سے معافی مانگ رہا ہے۔ میں نے سوچا یہی مناسب ہے کہ اسے حویلی آنے کی اجازت دے دی جائے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے نواز؟“ بڑے ابانے پوچھا تھا۔

”آپ نے اسے آنے کی اجازت دی ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہو گا۔ ہمیں اس فیصلے پر کوئی

اعتراض نہیں ہے۔ غلطیاں تو ہم بڑوں سے بھی ہوئی چاہا کرتی ہیں۔ وہ تو پھر بچہ تھا اس نے اپنی غلطی تسلیم کی تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ جتنی سزا بھگتی تھی بھگت چکا۔ اب یہی مناسب ہے کہ بچہ اپنے گھر میں رہے۔“
 لیانے تنازع سے کہا اور میں دنگ رہ گئی۔

ابا تو کہا کرتے تھے کہ میں دل بن کر ان کے اندر دھڑکتی ہوں تو کیا انہیں یہ خبر نہیں کہ وہ ”بچہ“ جاتے جاتے ان کی بیٹی کو کیسی وحشتیں بخش گیا تھا۔ ان خاموش عینیں گھرانے کے انداز میں مکمل کی تلوکی جھٹک رہی تھی۔

بڑے اباب قادر پچاس سے کچھ کم رہے تھے۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ خوشی کی شدت سے ان کی آواز کپکپانے لگی تھی اور چہرہ سرشاری سے دھپک رہا تھا۔

غزالہ چلتی کے چہرے پر کرب آمیز خوشی تھی اور ان کی چلیں چلی ہوئی تھیں اور وہ بہت منگور نظروں سے بڑے اباب کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت قادر پچاس کی تھی۔ آج تک انہوں نے حسین کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر مجھ سمیت اس گھر کا ہر فرد جانتا تھا کہ حسین کی دوری سے وہ اندر ہی اندر مومڑی کی طرح پھسل کر ختم ہو رہی ہیں۔

”زہرا نام ٹھیک سے کھائیں گے رہیں۔“ میں نے مجھے ٹوکا تو میں پلیٹ پر جھک کر کھانے کی کوشش کرنے لگی مگر میری کوشش بے سود تھی۔ میرا دل بچھاڑیں کھا کھا کر رو رہا تھا۔

اور اس وقت میز پر موجود ہر فرد بے انتہا خوش دکھائی دے رہا تھا وہ سب کے سب ”اسی“ کے بارے میں بات کر رہے تھے مگر کوئی میری جانب نہ دیکھ رہا تھا کہ میں کیسا محسوس کر رہی ہوں۔

میں نے سب کی جانب دیکھا سب کی خوشی کا احساس بھڑکے ہوئے لالہ کی تپش کی طرح مجھ تک آیا مگر میری آنکھوں میں کراہی التجائیں کسی نے نہ سہیں۔

کسی کو میرے دل کا کرب دکھائی نہ دیا۔

کوئی میرے غم میں شریک نہ ہو سکا۔

اور میرا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اپنے کمرے تک کا فاصلہ کیسے طے کیا یہ میں نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ واپس آ رہا ہے پھر سے میرے صبر کو آزمائے۔ میری برداشت کا استحسان چلتے۔

سوچی اور پاسی نشن پر بارش کی کن من بھی ٹھنڈا ال رہتی ہے مگر میرے دل کی نشن کی پیاس آنکھوں سے برستے چھانچوں چھانچوں منہ سے بھی نہیں بجھتی۔ اس پر پھول نہیں آتے کٹائے گئے ہیں۔

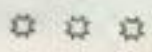
اور یہ کانٹے میرے وجود کو زخمی کر رہے ہیں میرا دود خون میں بہہ رہا ہے۔ خدا کے لیے حسین مت آگے۔ میں نے جو صبر کیا وہ میرے حوصلے سے بڑھ کر ہے۔ میں کیسے برداشت کر پاؤں گی۔ خدا کے واسطے مت آگے۔ میں تمہیں کیسے دیکھ پاؤں گی اس کے ساتھ۔

میرے وجود کا ہر حصہ اس کی منتیں کر رہا ہے مگر میں جانتی ہوں وہ نہیں سنے گا اس کی ساتتیں تو میں نے اپنے ہاتھوں سے بند کی ہیں۔ وہ کیسے سن سکتا ہے مگر آپ تو میری سسکیں سن رہے ہیں۔ غور سے سنئے۔ ان سسکیں میں ایک ہنسی بھی شامل ہے۔ یہ میرے غم کی ہنسی ہے۔

میرے کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ میرا ضمیر بھی میرے راز کا شریک ہے۔ اس نے بھی مجھے ان دیواروں کی طرح روتے شگئے مسکایں لیتے دکھائے یہ سنگی نہیں ہے مگر یہ بھی مجھے تسلی نہیں دیتا۔

اس کہنے کو صرف ہنسا آتا ہے۔ لب بھی دیکھیے ”ہاں“ ماننے کی دیوار سے لگا میری بے بسی پر ہنس رہا ہے۔ اہل دھوکے بات۔ میرا حصہ ہے مگر کچھ پر خندہ زن ہوتا ہے۔

آپ جانتے ہیں نا پرانے کرب تازہ ہوں تو آنکھیں بہتی ہیں۔ آنکھیں ہمیں تو راتیں جاتی ہیں اور میری راتیں تو دنوں سے جاگ رہی ہیں۔



مجھ سے بچا دے۔

پانچ سال پہلے کی وہ صبح بڑی خوبصورت تھی۔ پانچ سال پہلے کی ہر صبح مجھے خوبصورت لگا کرتی تھی۔ لادس کی سی نارنگیاں تو میری منہوں میں اب اتری ہیں۔

مگر اس صبح کا ہر لمحہ حدی پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ اس دور میں میں نے انتظار سے بڑا کرب نہیں جھٹلایا تھا سو انتظار ہی میری سب سے بڑی لذت تھا۔ ایک ایسی لذت جس میں امید کی مٹھاس ساتھ ساتھ چلتی ہے جو تکلیف دہتی ہے باہوی نہیں۔

”بھئی! آخر مسئلہ کیا ہے۔ کیا آج فرسٹ کیس ڈالنے کا ارادہ ہے؟“

میں غالباً ”ہاسل کے مین گٹ تک دسواں چکر لگا کر کمرے میں واپس آئی تھی۔ جب سحر نے میری بے چینی محسوس کرتے ہوئے ٹوک دی دیا۔ میں کھیا کر ہنس دی۔

”بس بونٹی۔“ سحر سامان پیک کرتے ہوئے معنی خیزی سے سکرادی جیسے کہہ رہی ہو۔ ”ہم سب سمجھتے ہیں جناب۔“

یہ لکھا ہوا تو میں کب سے اس کے چہرے پر دیکھ رہی تھی میں جانتی تھی کہ وہ میری بے چینیوں سے بیوقوف نہیں ہے۔ محبت حد سے بڑھنے لگے تو خوشبو کی طرح بکھر کر پھیل جاتی ہے۔ سحر تو پھر بھی میری بہترین ہم جولی تھی جس طرح اس کے دل کی روشنی میری آنکھوں تک پہنچی ہوئی تھی ٹھیک اسی طرح وہ بھی مجھے حرف جانتی تھی یہ انگلیات ہے کہ میں نے آج تک اس کے سامنے اعتراف نہیں کیا تھا۔

”تم نے ڈیپارٹمنٹ نہیں جانے پہلی کلاس تو شروع بھی ہو چکی ہو گی۔“

الہادی سے کچھ نکالتے ہوئے وہ پھر سنجیدگی سے مجھے چارہی تھی۔ میں جب تیار ہو رہی تھی تو میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ مجھے ڈیپارٹمنٹ جانا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مجھے تو اس کا

استقبال کرنا تھا، سوائی جلدی میں کیسے جاسکتی تھی۔
”زہرا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے“ میں سوال
کرتی ہوں تو جواب دس منٹ بعد آ رہا ہے۔ آخر چکر
کیا ہے؟“

وہ میری ہے تو جیسی پر توکتی میرے بالکل سامنے
آ رہی تھی اور بغور مجھے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے اس
طرح اپنا سامنا نہ کرنے پر میں ہنس دی۔
”ہی“ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے مگر مجھے کچھ
بے چینی سی محسوس ہو رہی ہے۔ آج موسم بہت
خراب ہے۔“

سحر نے تعجب سے مجھے دیکھا پھر بالکونی سے نظر
آتے آسمان پر ایک واضح نظر ڈالی۔

”موسم نہیں“ اصل میں تمہارا دماغ خراب ہے۔
اچھا خاصا موسم خراب بنیوا۔“ وہ مجھے لٹاڑنے لگی۔
میں نے بھی باہر تھانکا۔ آسمان پر سرخی سے بادلوں کا
پکا دھواں تھا۔

”سحر! اگر بارش ہو گئی تو۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا
تو وہ ریمان سے ہنسی۔

”میرا سات کے موسم میں بارش ہی ہوتی ہے میری
جان“ تو نہیں چلتی۔“ میں چڑ گئی۔ آخر وہ میری بے
چینی سمجھ کیوں نہیں رہی۔

”اتنا روینڈنگ موسم ہو رہا ہے۔ کاش! احسین کے
بجائے مجھے دھاس لینے آ رہا ہوتا۔“ وہ لٹھنڈی آ کر بھر کر
بولی۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگی تو کچھ سوچ کر اس
سے پوچھا۔

”احسین نے کتنے بجے آنے کا کہا تھا؟“
”کہا تو بچے کا تھا مگر میرا خیال ہے سناڑھے تو تو ہو
ہی جائیں گے۔“

میں نے ریسٹ واپس پر نگہ ڈالی۔ ابھی تو نو بجتے میں
تو کھانسنہ باقی تھا۔ میں کچھ بد دل سی ہو کر باہر نکل
آئی۔

سحر نے درست کہا تھا، اچھا خاصا موسم تھا۔ میں
انتظار کی سٹی پر نہ تھی ہوئی تو جی بھر کر موسم کی
خوبصورتی کو محسوس کرتی مگر اس وقت مجھے اس موسم

میں ذرا بھی خوبصورتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
وہی درخت، جو عام دنوں میں آتے جاتے دکھائی دیا
کرتے تھے، اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ فرق
صرف یہ تھا کہ مسلسل رہتے والی بارشوں کے نتیجے میں
صاف ستھرے ہو گئے تھے۔

آسمان پر ویسے ہی بادل تھے جو روز آتے، خوب جم کر
برستے اور غلے جاتے۔

ہاسٹل کے گیٹ سے لڑکیاں آ جا رہی تھیں۔ بس
وہی نہیں آ رہا تھا جس کے انتظار نے میری پیروں سے
پکڑ باندھ دیا تھا۔

حسین! قائد اعظم یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم
فل کر رہا تھا جبکہ میں اور سحر لاہور میں زیر تعلیم تھے۔
جب میں نے لی اے کیا تو میں بھی قائد اعظم یونیورسٹی
میں ایڈمیشن لینا چاہتی تھی اور گھر میں کسی کو میرے
اس رجحان پر اعتراض بھی نہیں تھا۔ فیوڈل بیک
کراؤنڈ کے بلکہ جو ہمارے خاندان میں پڑھائی کا رجحان
تھا۔ بڑے ابا تک نے انگریزی میں ایم اے کر رکھا
تھا۔

میرا ارادہ قائد اعظم یونیورسٹی سے نفسیات میں ایم
ایس سی کرنے کا تھا مگر سحر کی وجہ سے مجھے پنجاب
یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا پڑا۔ اس کا میرا بیجا جھگڑ
بہتری تھا اور میرٹ میں بھی اس کا نام نہیں آ رہا تھا۔
ہمارا لگاؤ ساہیوال سے دس منٹ کی ڈرائیو پر شال
کی جانب تھا۔ یوں ہم دونوں لڑکیوں کا آنا جانا حسنین
کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اس
ڈسے داری سے گھبراتا بھی نہیں تھا اور بڑی خوش
اسٹولی سے یہ ذمہ داری نبھائے جا رہا تھا۔ (زمہ دار یوں
سے پہلو تھی کرنے والے حسنین قادر کی اس ادا میں
کوئی تو ایسی بات تھی جو میری تقویت کا باعث بنتی
تھی۔)

ایسا نہیں ہے کہ وہ احساس میرے اندر اس سفر کے
دوران پروان چڑھا بلکہ میں خود بھی اس لمحے کی
کارگزار سی سے ٹکراتی ہوں۔ جب حسنین کی چاہنے
میرے اندر نقب لگائی غالباً اس احساس کا سلسلہ تو

بچپن کی معصومیت سے بڑا تھا۔ بچپن کی دوستی کب
محبت میں ڈھل جاتی ہے خبری نہ ہو سکتی۔

وہ خاندان بھر میں میرا واحد ہم عمر اور دوست تھا مگر
اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنا پر ہمیشہ تعلیمی میدان میں وہ
قدم آگے رہا۔ جن دنوں میں نے لی اے میں ایڈمیشن
لیا، وہ ایم ایس سی کرنے اسلام آباد چلا گیا۔

اس کی غیر موجودگی میں میں بھی بھڑکتی رہی۔ بچپن
ہوئی اور کوئی لمحہ ہاتھ آئے بنا مجھ پر انکشاف کر کے چٹا
بنا۔

میں کئی دن تعجب میں جھلا رہی اور پھر مجھ پر میری
بقی نگاہوں کی داستان واضح ہوئی چلی گئی۔

مجھ جیسے لوگ خصوصاً ”لڑکیاں عموماً“ اس رستے پر
چلنے کی قائل ہوتی ہیں جو ان کے لیے دل بناتا ہے وہ
دل کی سنتی ہیں اور اس کے فرماں پر ہمیشہ لبیک کہتی ہیں
اور میں لبیک کیوں نہ کہتی۔ حسنین میں آخر کی ہی گیا
تھی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ اس کے دل میں میری کیا
حیثیت ہے مگر میرا دل خوش قسم ہر بار میرے آہٹل
سے امید باندھ دیتا تھا کہ ہونہ ہو حسنین قلور کے دل
میں میرے ہی نام کی شمع جلتی ہے۔

جگر مراد آبادی تو محبت پر مبنی ہی رہتی ہے، سو میری
بھی یہی کیفیت تھی۔ ہرگز زمانہ میری محبت کو پسے
سے شدید کر رہا تھا۔

ایک دم لٹھنڈی ہوا کا نام جھونکا آیا اور مجھے چھو کر چلا
گیا۔ یہ پہلا جھونکا تھا جس کی تراوت کو میں نے
محسوس کیا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر حسنین کی
لینڈ کروزر رکھی تھی۔ وہ ڈسٹر اسکرین سے وہ مجھے دیکھ کر
”سکرایا“ وہی اس کی بے انتہا پرکشش مسکراہٹ۔
چونکہ اس کے چہرے پر سنجیدگی کا عنصر نمایاں تھا، اس
لیے مسکراہٹ بہت سہلی معلوم ہوتی تھی۔

میری بے چینی کے سیکٹے کو مکلوں پر لٹھنڈے جھینٹے
آکرے اور میں پر سکون ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔
وہ دروازہ کھول کر میری طرف آیا تھا۔

”کیسے ہو؟“ میری نگاہیں اس کے چہرے کا طواف

کر رہی تھیں۔
”تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ پھر مسکرایا اور بڑی
رتھکس سانس بھرے بندروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا
ہو گیا۔

وہ بہت زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میرے دل نے
عجیب خواہش کی کہ اس کی فراخ پیشانی پر اپنی پھیلی
رکھ کر ساری سحرانہ سمیٹ لوں۔

دل میں چور نہ ہوتا تو غالباً میں ایسا کر بھی مقرر تھی مگر
موقع تھا نہ مقام۔ جلب آڑے آ گیا اور میں دل
موسم کر رہ گئی۔

”تمہارے لیے چائے لائوں۔“ میں نے اس سے
پوچھا۔

”اے نہیں“ تب تو حویلی جا کر ایک ہی پار چائے
پیتیں گے۔“ وہ میری طرف دیکھنے لگا اور میں سر تھکا کر
اپنے ہاتھوں میں چپے اس کے نام کو۔ میں کسی اور کی
کیفیت نہیں جانتی، صرف اپنا پتا ہے کہ جب محبت
غالب ہو رہی ہو اور اظہار کا لمحہ نامعلوم فاصلے پر تو وہ
دوستوں کے مابین بھی بات بے بات خاموشی وارو
ہونے لگتی ہے۔

سحر آئی اور حسنین کو دیکھ کر اپنا بیک لینے چلی گئی۔
”ایسا مطلب ہے تم ہمارے ساتھ نہیں چل رہی ہیں
زہرا؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔ میں نے لٹی میں
گردن ہلا دی۔

”اسائنمنٹ جمع کروانی ہے، ان دو چینیوں میں گھر
چلی گئی تو یہ کلام نہیں مناسکوں گی۔“ میں نے غدر بتایا
تو اس کے چہرے پر ہلکی سی چھائی۔

چچ کہتی ہوں زندگی میں ایسے بہت کم لمحات آتے
ہیں جب کسی کی مایوسی آپ کی خوشی کا سبب بنتی ہے۔
وہ لمحہ میرے لیے ایسا ہی خوش کن تھا۔ اس کی مایوسی
میری محبت کے حق میں تھی۔ یعنی وہ اس خیال سے
ہلکی ہے کہ یہ چھٹیاں میں اس کے ساتھ حویلی میں
نہیں رہوں گی۔

”جب میں گھر ہوتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے۔ گھر
کا ہر فرد گھر میں موجود ہو، کوئی ایک بھی نہ ہو تو مجھے اچھا

وہ کہہ رہا تھا اور میں اپنی بولانی پر ہنس رہی۔

"اسے دل خوش ہے، میرا چیرا خرقہ اتنی ہی دیر میں کیا کیا سوچ ڈالا۔ تو مجھے کمر کا ایک فرو بھتا ہے گویا کوئی انفرادی حیثیت نہیں جیسے سب لوگ فکری ہی میں۔"

"کیا ہوا۔ تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں، بس یونہی۔ مگر میں سب کو سلام کہتا۔"

"ہوں۔" پھر سرسری سے انداز میں میری ٹھوڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" میں چونکی۔ ہاتھ بے اختیار ٹھوڑی تک چلا گیا۔

"کیا؟ کمال۔؟" میں جھک کر گاڑی کے بیک مرر میں دیکھنے لگی۔

ٹھوڑی پر نہایت ہلکی سی خراش تھی جو بہت غور سے دیکھنے پر دکھائی دیتی تھی۔

"پرسوں ناخن لگ گیا تھا۔" میں نے بتایا تو وہ فٹ کر بولا۔

"چلیں کی طرح ناخن پوسھا رکھے ہیں، لگتا تو تھا ہی۔ ابھی جا کر اس نحوست کو کاٹو۔" میں برس برس منہ ہلانے لگی۔ وہ ہمیشہ میرے ناخن پر جانے کے شوق سے چڑتا تھا۔ حویلی میں تو لوگنے کو بہت تھے البتہ ہاسٹل میں میں اپنا یہ شوق خوب پورا کر رہی تھی۔

مگر کو میں نے خوب زور سے کھٹے لگا کر خدا حافظہ کہا اور خالہ جان کو سلام بھجوا یا پھر حسنین کو احتیاط سے ڈرائیو کرنے کی تاکید کر دی تھی، جب اس نے اپنا مضبوط ہاتھ مصافحہ کے لیے میرے سامنے کر دیا۔ یہ معمول کی روشنی تھی۔

اس نے میرے بازو کے ہاتھ کو بہت زور سے دبا دیا۔ میں جچ اٹھی۔ اس کے مضبوط ہاتھ کا لپکا سا ہونے میرے ہاتھ کے لیے بہت ثابت ہوتا تھا مگر وہ ہمیشہ یونہی کرتا تھا۔

اب بھی ہستے ہوئے دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے

تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔

"ابھی فوراً" جا کر ناخن کاٹ لیتا ورنہ دوسرے گل پر بھی لگ جائے گا۔"

"کمال ہے چودری حسنین، فوراً تم نے میری ٹھوڑی پر ایسی معمولی خراش تو دیکھ لی جو اب مٹنے کو ہے مگر میری آنکھوں میں بسامیت کا جہل نہیں دیکھا۔ کیا بات ہے تمہاری زیرک نگاہ کی۔"

ناخن تراشتے ہوئے میں مسلسل سوچ رہی تھی۔



مگر واپس آئی مگر تھا نہیں تھی بلکہ کسی کی بے اعتنائی کی شکایت بھی ساتھ ہی لے آئی تھی۔

"اسے کوئی جوس وغیرہ پلاؤ۔ پچاری نے آدھا خون تو رو دھو کر خشک کر لیا ہے۔"

حسنین ہی اسے چھوڑنے آیا تھا اور شرارت سے تاکید کر گیا تھا۔ عمر نے روٹی روٹی آنکھوں سے بہت خشکی سے اسے دیکھا تو وہ ہستے ہوئے گاڑی بھاگ لے گیا۔

"پتا تو طے۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں تیزی سے اٹتے آنسوؤں کو دیکھ کر میں نے تھک کر پوچھا۔ عمر نے کوئی کھانا تاکو۔ میرے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میری پوزیشن بگڑ گئی۔ آتی جالی لڑکیاں ہمیں عجیب نظموں سے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ تو اصل صورت حال جاننے کے لیے قریب بھی رک گئیں۔

میں جیسے تیسے اسے سمجھا بجا کر کمرے میں لے آئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے۔ بس بدخ خراب ہوا تھا کہ وقاص جیسے پتھر دل لگا ہی۔" وہ دوتے دوتے واٹس روم کی جانب چل دی اور مجھے ساری بات سمجھ آ گئی۔

مگر بہت معصوم بلکہ کسی حد تک بے وقوف سی لڑکی تھی۔ بہت ساری باتیں جو ہماری عمر کے لوگ سمجھ لیا کرتے تھے وہ اسے تفصیل سے سمجھانا پڑتی

تھیں۔ اور اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس نے وقاص جیسے پتھر دل سے صرف دل ہی نہیں لگایا تھا۔ بلکہ اس کے نام کی انگوٹھی بھی پہن رکھی تھی۔ اس رشتے میں پہلے بزرگوں کی مرضی شامل ہوتی پھر فطری واردات کا قفل دخل شامل ہوا۔ اپنی معصومیت کے باعث اس نے وقاص سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ وہ ہر وقت نہ تو اس کی تعریفیں کر سکتا تھا اور نہ ہی ہر وقت اس کے گلے سے لگ کر بیٹھ سکتا تھا۔

میں کئی بار یہ بات عمر کو سمجھا چکی تھی وہ ہر بار سمجھ کر میری مشکور ہو جاتی تھی۔ مگر کچھ دنوں بعد یہ بات پھر اس کے ذہن سے محو ہو جاتی تھی اور وہ پھر سے وقاص سے شکوہ کنال دیکھائی دینے لگتی تھی۔

عمر کے پرس میں رکھا موبائل بجنے لگا تھا۔ ہم دونوں کے پاس ایک ہی موبائل تھا۔ اس لیے میں نے بلا جھجک اس کا پرس کھول کر موبائل نکال لیا۔ اس نے اسکرین پر وقاص بھائی کا نمبر جھگڑا تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسا خیال رکھنے والا "پتھر دل" ہر ایک کو تھوڑا سی ملا کرتا ہے۔

"السلام علیکم۔" زہو بات کر رہی تھی۔

میں نے فوراً ہی بتا دیا کہ وہ مجھے عمر کے کمرے کی بھی نوعیت کی روایت شک انگشتوں شروع کر دیں۔ میری شرارت سمجھ کر وہ ہنس دیے تھے۔ جسم کے لیے میں بولے۔

"بہت اچھی طرح سے پہچانتا ہوں تمہیں۔"

"اور آپ نے میری ہی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا ہوا؟"

میں پھر شرارت سے گویا ہوئی۔ وہ چند لمحوں خاموش رہے پھر فٹکتے ہوئے لمحوں میں جا کر بولے۔

"زہو لی بی! مجبور وہ بسوں کے ساتھ مذاق کرنا نہایت ہی غلط بات ہے۔" میرا قبضہ چھوٹ گیا۔

"کمال ہیں وہ آپ کی سہیلی۔؟" انہوں نے پوچھا تو میں مزید تنگ کرنے لگی۔

"میری سہیلی آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے ابھی ابھی مجھ سے کہا ہے کہ وہ اب ساری زندگی

آپ سے بات نہیں کرے گی۔" میرا لہجہ جسم و شرع تھا۔

"اگرے تو آپ کو کچھ میں ڈالا ہی کس لیے ہے ذرا جلدی سے اپنی سہیلی کو ہم سے بات کرنے کے لیے آگاہ کرو۔ باقی زندگی کی خبر ہے یونے بھی سنا ہے وہ شوہر دنیا کا خوش قسمت ترین شوہر ہوتا ہے جس کی بیوی قوت گویائی سے محروم۔"

"بہت غلط بات ہے" وقاص بھائی! آپ میری سہیلی کو بہت ستاتے ہیں۔"

"فی الحال تو تم مجھے ستا رہی ہو۔! احسن لڑکی! جلدی سے بات کرو! تمہیں ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ اس کی خشکی کے خیال نے میں کی روشنیاں گل کر رکھی ہیں۔"

میں جو نہ سنا شروع ہوئی تو پھر ہنسی ہی چلی گئی۔ عمر نے اندر آکر مجھے جب سے دیکھا۔ میں نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔

"تو بات کرلو۔" اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھایا۔ پھر وہی بل بھر کر سوچا اور رخ پھیر لیا۔

"بھیت نہیں کرنا۔"

"لونی۔ اسے کہتے ہیں محبت۔ بات مجھ سے ہو رہی تھی، خوشبو آپ تک پہنچ بھی گئی۔" میں نے زبردستی اس کے ہاتھ میں موبائل تھموا۔

"انہوں نے پہل کی ہے، پلو! جمی بیچوں کی طرح بات کرو۔"

اس نے میری جانب خشکی سے دیکھا، پھر دیر سے سے مسکرائی اور آنکھوں میں می لیے کرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے پُرسکون ہو کر اس کے سلمان کا بیک ٹھکانے لگایا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ مجھے پتا تھا سحر اب بہت دیر بعد کمرے میں واپس آئے گی۔ وقاص بھائی سے بات کرتے ہوئے وہ وقت بھول جایا کرتی تھی۔ میرا ذہن ادھر ادھر لوہر بھٹکتے ہوئے "زندگی" کی جانب مڑ گیا۔ اس کا اپنا ہی مزاج تھا اپنا ہی انداز۔ لاڈ لہو آنے پر آتا تو اس سے بڑھ کر کوئی اور موڈی نہ بچتا اور لاڈ

اٹھانے پر آتا تو دوسرے کو آہٹیں پر پہنچا دیتا۔

چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے ارباز لالہ تھے اور ارباز لالہ کے دس سال بعد وہ دنیا میں آیا۔ ہم دونوں کی معمول میں بس چند ماہ کٹتی فرقی تھا۔ مجھ سے پہلے میرے ماں باپ کے دو بچے نومولود کی منہ خدا کے پاس واپس جاسکے تھے اس لیے میری پرورش یوں کی گئی جیسے کوئی پھیلی کے چھالے کو سنبھالتا ہے وہ چھوٹا تھا میں اکلوتی۔

ہم دونوں کو پروان چڑھنے کے لیے کم و بیش ایک سا ماحول ملا اور ہم دونوں نے بزرگوں کے پیار کو خوب خوب سمیٹا اور دوستی کے رشتے میں مقید ہوئے وہ کافی تیز تھا ورڈ بن سکول تو ہم اکیسے ہی جانتے تھے مگر محدود دو کلاس آگے بڑھ گیا مگر ہماری دوستی جوں کی توں قائم رہی۔

ایک سے ماحول اور صحبتوں کی فراوانی کا ہم دونوں پر قدرے مختلف اثر ہوا۔ میری سمجھ بوجھ، فہم و فراست کا پورا خاندان قائل تھا جب کہ حسنین میں کچھ خود سری تھی (اور جانے کیا تھا اس خود سری میں کہ میری بلکس اس کے ہر ہر قدم پر سجدہ کرنے کو تیار رہتی تھیں)۔

عموماً میرا اور سحر کا تعلق کیا جاتا وہ بڑی خالہ کے بچوں میں میری ہم عمر تھی۔ ڈیڑھ سال سے بہن بھائیوں کی موجودگی میں اس کی شخصیت ٹھیک سے ابھرنے لگی تھی سو زیادہ لوگوں میں کچھ گہرائی ہوئی رہتی جیسے سنا ہوئی مشہور تھی۔ خاندان بھر میں میری اس سے دوستی ہوں ہوئی کہ ہم ہم عمر ہونے کے ساتھ ہی ایک ہی اسکول اور کلاس میں زیر تعلیم تھیں۔ خالہ کا گھر ساہیوال میں تھا۔ پہلے لالہ میرے کہنے پر سحر کو حویلی لے آئی تھیں۔ دھیرے دھیرے سحر کی اپنی مرضی بھی شامل ہونے لگی اور یوں وہ زیادہ تر ہمارے ہاں ہی رہتی جاتی۔

پہلے میری اور حسنین کی دوستی حویلی میں مشہور تھی پھر اس شہرت میں سحر بھی شامل ہوئی پہلی گئی اور یوں ہم تینوں بہترین دوست بن گئے۔ بلکہ یوں کہنا

مناسب رہے گا کہ ہم تینوں ایک دوسرے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔

سحر کا کٹا جانا تو لگا ہی رہتا تھا، ایسی ہی کسی ملاقات میں وہ پچھو کو اپنے بیٹے یعنی وقاص بھائی کے لیے پسند آئی۔ یوں سلسلہ دراز ہوتا ہی چلا گیا۔

سحر جس وقت واپس کرے میں آئی میں غینہ کی واوی میں اترنے کو بھی انگریز کی طرح کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

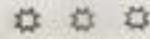
"میں بتائیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔"

اس نے کھٹکھٹلاتے لہجے میں کہا اور اپنی خوشی کی خوشی میں میرے لیے چائے بنانے لگی۔ کچھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی اس کے چہرے پر پھلنے والے رنگوں نے مجھ سے ساری دکایت بیان کر دی تھی۔

میں بستر پر لیٹی بیسوت سی اسے دیکھ گئی۔

یہ صرف میں جانتی ہوں کہ اس وقت مجھے کس قدر رشک آ رہا تھا۔ وہ بہت عام شکل و صورت کی لڑکی تھی مگر محبت کے احساس میں محصور ہو کر بے حد خوبصورت دکھائی دینے لگتی تھی۔

مجھے اکثر یہ خیال آتا تھا کہ جب اس عام سی لڑکی کو اظہار کے چند بول حسنین پہنچتے ہیں تو اظہار کا پہلا لمحہ مجھ پر کیا قیامت ڈھائے گا اور میرا دل رواں اس لمحے کے انتظار میں سرسبز وجود تھا۔



ایک طرف محبت میں کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے جب انسان چاہے چاہے جلنے کی تڑپ میں جھٹکا ہو جانا ہے۔

ان دنوں میں کچھ ایسے ہی احساسات کا شکار تھی۔ جو لوگ محبت میں اظہار کے قائل نہیں ہوتے وہ جانے کیسے زندگی گزار لیتے ہیں۔ میں تو جھکنے لگی تھی۔ دل چاہے لگا تھا وہ کشور صرف ایک بار میرا ہاتھ تمام کر مجھے اظہار کی بارش میں بھگو ڈالے۔ میں خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کرنا چاہتی تھی۔

میرے لیے اس کی اپنیت اس کی توجہ اس کی

دوستی کم ہونے لگی تھی یا شاید میرے نزدیک یہ چیزیں اہم ہونے ہوئے بھی اپنی قدر کھو رہی تھیں۔ میں اظہار چاہتی تھی۔ بغیر نہیں اظہار۔

شاید میں ہمیشہ سے الفاظ کی بھوک رہی تھی۔ ارباز لالہ کی شادی کی وہ رات کسی انمول خزانے کی مانند میرے حاشے میں محفوظ ہے۔

ہم سب گزرتی جمع تھے۔ بڑے چھوٹے سب۔ جب کسی نے حسنین کی شادی کا شوہر چھوڑ دیا۔

"ارے کیوں نہیں دیکھنا میں اپنے لالہ کے لیے چاند سی دلن لادوں کی۔" غزالہ چاچی نے مست لالہ سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے جیسی نظموں سے میری جانب دیکھا تھا وہ وہاں موجود ہر شخص کو بہت کچھ سمجھا گئیں۔ اور میں۔ مجھ سے اپنا دل سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"دیکھ بھال کے مہمان جان! میرا خیال ہے لالہ کے ساتھ چاند کا سلیم کچھ نیچے گا نہیں۔" جانے کس نے کہا۔ ایک قدم بلند ہوا۔

"کیوں نہیں نیچے گا بھئی؟ ہم چاند کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لیں گے۔"

"یہ تو انبہ شوخی و تبسم میری بھیلیوں میں بہنے اتر آیا۔ دل چاہا اس اک نظر اسے دیکھوں۔

وہ اپنی دلکش مسکراہٹ سمیت معنی خیز نگاہوں سے مجھے تنک رہا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن کچھ اور بے ہنگم ہوئی تھی۔ پکوں پر اس کی نگاہوں کی تپش آج ضروری تھی۔

پھر مجھ سے زیادہ دیر وہاں نہیں گیا اور میں اپنے کمرے میں آئی۔ دیر تک خود کو تکیے میں دیکھتی رہی۔ اپنے روپ سروپ کی تعریفیں میں نے پہلے بھی سنی تھیں۔ آج بھی ہر ایک نے مجھے سراہا تھا۔ مگر اس بل کی توجہ ہی فراموش تھی۔ اظہار کی اس پہلی نظر نے میرے روم و دم کو روشن کر ڈالا تھا۔

انسان جب محبت کر رہا ہوتا ہے تو اس کے پیر زمین پر ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ محبت کے جانے کے احساس میں جھٹکا ہوتا ہے تو وہ آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ میں بھی

ایک ہی جست میں زمین سے آسمان تک کا فاصلہ طے کر گئی تھی۔

"مشق رے عشق! اتیری خیر ہو۔"

ایک ہی رات میں میرے دامن کو کس قدر بھر دیا۔

وہ رات میری زندگی کی تمام راتوں میں یادگار بن گئی تھی۔



میں شالواں و فرحان زندگی جیسے جا رہی تھی۔ وہی خواب جنہیں دیکھتے ہوئے پہلے میں کھڑا چایا کرتی تھی اور خود کو ڈھپ دیا کرتی تھی کہ میں ان خوابوں کی کڑیاں ہی نہ چننی پر چاچاں۔ مگر اب وہی خواب میں بڑے شوق اور چاہ سے بننے لگی تھی۔ بھول کر بھی کوئی خوف میرے قریب نہیں آیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ یک طرفہ محبت بھڑے ہوئے پانی کی سی ہوتی ہے۔ جس میں بھنور نہیں اٹھتے۔ سلاب نہیں آتا، بس ہوا کی ترش روی سے لہریں اٹھتی ہیں۔ اور اگلے قدم پر پر سکون ہو جاتی ہیں۔

یک طرفہ محبت سدا ایک طرفہ ہونے کا غذاب جھیلے تو وقت اپنی نشانی کے طور پر اس کی سطح پر کالی ضرور چھوڑتا ہے۔ مگر کالی کی اس تہ کے نیچے پانی کا احساس کبھی نہیں جاتا۔

جب کہ وہ طرفہ محبت سہمی ہوئی ندی بن جاتی ہے جس کے بہاؤ میں بھی طغیانی آتی ہے، بھی رواں بھی ٹھہرتا تو کبھی سکون۔ اس پتھویشن میں طرفین کا تعلق بہت متوازن ہوتا ہے۔ کوئی محبوب ہوتا ہے نہ محب۔ مگر دونوں محبوب بھی ہوتے ہیں اور محب بھی۔ یوں ترانہ کے پلڑے برابر ہونے سے زندگی کٹ جاتی ہے۔

میں کس اسٹیج پر تھی میں نہیں جانتی میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میری محبت میری انگلی پکڑ کر مجھے شدت کی ایک اور سیڑھی عبور کر دیتی تھی۔

میں ہواؤں میں تھی اور خوشی کے جھولے جھولتی تھی۔ آسمان کے سفر پر نکلے ہوئے کیا خبر کہ زمین پر کون سی قیامت ان کی کھڑکی پر ہے۔ میں بھی آسمان پر ہی تھی۔ سو قیامت خود ہی مجھ تک پہنچی آئی۔

"حسین نے تمہارے لیے پیغام بھجوایا ہے۔" سحر نے مسرور لہجے میں بتایا۔

"کیا؟" میرا دل رواں دواں ساعت میں ڈھل گیا۔ "پتا ہے اس نے ہمارے لیے بھابھی ڈھونڈ لی ہے۔ قسم سے زہرو! میں نے اسے اتنا خوش بھی نہیں دیکھا۔ کہہ رہا تھا تم سے بھی کہہ دوں کہ تیار ہو کر کسی روز چانگنی ہم دونوں کو اس سے ملو اور گاہ۔"

میں نے کہا تھا قیامت انتظار نہیں کرتی۔ جانے سر سے آسمان کھینچا تھا یا بیروں سے کی زمین۔ میں تو بس خلا میں معلق ہو گئی تھی۔ بہت دیر تک مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ میں ٹنک تھی۔ ساکت تھی۔ بے یقین تھی۔

میں نے سحر کی جانب دیکھا۔ ممکن ہے وہ جھوٹ بول رہی ہو مگر وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی اس نے آج تک مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ معصوم تھی۔ بے وقوف تھی۔ بوگی بھی تھی مگر مذاق کرنے کے سلیقے سے واقف تھی۔ وہ مذاق اور جان لیوا مذاق میں فرق جانتی تھی۔

مگر اس لمحے میری پیاری سہیلی، اپنے دوست کی زندگی میں آئی ہمارا قصہ بہت خوشی خوشی سن رہی تھی۔ مگر یہ باز غریبہ بن کر مجھے نگل گئی تھی۔ عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

موبائل کی آواز نے بھی مجھے نہیں جھونکایا۔ ابلتہ سحر کی توازنے میرا سکہ ختم کر دیا۔

"ہیلو۔ ہیل۔ ہیل۔ تم فکر کیوں کر رہے ہو۔ ہیلو۔ ذمہ داری تو ساری کی ساری تمہاری ہے میں نے تو بس تمہارا ساتھ دیا ہے۔ وہ تو شاید سوچتی ہے اصل میں زہرو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تمہارا مہیج دے دیا تھا میں نے۔ اس نے

کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر ظاہر ہے تمہاری پسند دیکھنے کا شوق تو اسے بھی ہے۔ ہا۔۔۔"

میں نے کبل کے اندر دونوں کانوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیے۔ آسورانی سے بیٹے لگے تھے۔ دل چاہا تھر کے ہاتھ سے موبائل چھین کر اس کے نکلے کروں۔ اس کا گلا دبا دوں! ہر چیز جس جس کر ڈالوں۔

سینٹ سینٹ کر رہے خواب ملیا میٹ ہو گئے، منوں میں۔ ہر امید پر اس مٹ گئی۔ میری محبت سانس گھٹ جانے پر تڑپ رہی تھی اور میں کبل میں منہ دیے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ "یہ راز غرق ہو تمہارا حسین قادر۔" مجھے اس مقام پر لا پیچھا ہے۔ جمل واپسی کا کوئی رستہ ہی نہیں۔ میں خود حیرانوں میں کہہ رہا جاسکوں گی۔

وہی دل دہائیل ہو رہا تھا۔ میری وہ رات کانٹوں پر بسر ہوئی، میری ہر رات نے لب کانٹوں پر ہی بسر ہونا تھا۔

لب کانٹوں پر ہی بسر ہونا تھا۔

غافل جان بیکار تھیں سحر چٹیاں لے کر ساہوالاں چلی گئی۔ مجھے اپنا غم مٹانے سے فرصت نہ تھی کسی اور کا کیا احساس کرتی۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ دل میں کچھ صاف تم بھی نہ آتی تھی۔

محبت کی گفتگو ہوئی لاش یونی پڑی تھی مگر مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ جس محبت کو نیندوں کی آبیاری سے پرووں چڑھایا ہے اسے اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتار دوں۔

اسے کھونے کا غم بھی تھا، ٹھکرائے جانے کی اذیت بھی۔

مجھے زندگی کے ہر مقام پر تو صیف ملی تھی میں ہمیشہ نبھوں رہی تھی۔ میری خواہشات میرے کھیلوں اور دوستوں کے لیے ہمیشہ اولیت کا مقام رکھتی تھیں میں اس مقام پر غبرو ہوتی تب بھی اتنی تکلف نہ ہوتی مسئلہ یہ تھا کہ میں پہلے میرے صفر کردی گئی تھی۔

اور جو نمبروں پر رہا وہ اس کے لیے صفر ہونے کا کدھ کیا ہوتا ہے آپ کیا جانتیں۔

مجھے اپنی خوبصورتی پر کبھی یقین نہ ہوا تھا۔ اللہ کی دی ہوئی تھی اچھی دی یا بری۔ خبر ہے مگر اب مجھے دھچکا لگا تھا۔ کیا میری شکل اس قاتل بھی نہ تھی کہ حسین قادر رک کر سوچتا۔ کس نے کہا تھا اس سے کہ میرے اندر اپنی نگاہوں سے شخصیں روشن کرے اور پھر پھونکے مار کر مجھے تاریک کر دے۔

"تم نے ظلم کیا ہے حسین قادر۔ تم میرے مجرم ہو۔ میری خوشی کو مجھ سے چھین لیا تم نے مجھے غم دیا ہے۔ تمہیں خود کو خوشی کھل راس آئے کی۔ میں روتے روتے پگھل ہونے لگتی۔

بے توجہی پر پہلے کا اس فیلو نے ٹوکا پھر اساتذہ نے متنبہ کیا۔ مگر مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔ اپنی حالت کی میں خود غور دار تھوڑی تھی۔ ذمہ دار تو وہ تھا جس نے دوست بن کر مجھے بس لیا۔

میری زندگی کاغذ اب۔

اب کسی کام سے لاہور آئے تھے۔ میری حالت دیکھی تو دمک رہ گئے اور ساتھ ہی لے کر حویلی واپس آئے۔ میں اتنا نہیں چاہتی تھی اس دشمن جان کا خیال ہی کیا کم از کم تاک تھا حویلی اگر ہر وقت کا ساتھ ہو جائے۔

مگر اتنا ہی بڑا۔ تقدیر اپنے فیصلے خود کرواتی ہے۔ حویلی میں سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں بیکار نہیں تھی مگر تیاروں سے برے حال میں تھی۔ صدقہ خیرات کا سلسلہ چلا۔ میں اپنے لیے نہیں اپنے گھر والوں کے لیے خود کو سنبھالتی چلی گئی۔

اور جب سنبھل چکی تو وہ "پر حوائی مکمل کر کے چلا آیا۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کھانے کو نہیں ملتا کیا؟"

ٹھوڑی کے زخم کی طرح اب بھی وہ میری ناسازی طبع کی گایا اور تو اور بڑھ کر پیشانی پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔ "لفس۔" میں اندر تک لرز گئی۔ اس سے تو اچھا

تھا، کوئی میری پیشانی پر چھتی ہوئی سلاخ رکھ دیتا۔ "زہرو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ احمق کچھ کھاتی بھی تو نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ خون ٹھیک سے نہیں بن رہا۔ کمر میں جو آگنی ہوں۔ ہم دونوں مل کر اس کا خیال رکھیں گے۔ دیکھنا، دونوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔" سحر کل رات سے آئی ہوئی تھی۔

"تم سناؤ، بڑی صحت بنا رکھی ہے۔ لگتا ہے عشق زوروں پر ہے۔"

"میری عشق تو ہمیشہ سے زوروں پر رہا ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہاں بہت دور ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس مگر کر کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔

میں بھڑبھڑاتے ہوئے گئی، دل چاہا اہن کے ہتھ بستے چروں کو آگ لگا دوں۔ مجھے آنسو ملے تو ان کے صے میں مسکرا اٹھیں کیوں؟ خدا کرے تم بھی غم کی آگ میں جلو! ان کی غمی میرے دلخ پر کوڑوں کی طرح برستی رہی۔

استحقاق ختم ہوئے تو حسین ہمیں لینے آیا۔

میں پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی جب کہ سحر اگلی سیٹ پر تھی۔ ہنسی مسکراتی، فریٹش سی۔ میرے ہاتھوں میں سنبھل دھوڑی آگنی تھی۔ جس کا ہر لہلا ہی نہ تھا۔ سحر تو جانتی تھی کہ میں کیا سوچتی ہوں۔ یہ مجھے حسین کا ہم لے کر چلایا کرتی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ یہ کیوں بھول گئی کہ میں نے اپنی خوشیاں اس شخص سے وابستہ کی ہیں۔

"اور یہ شخص۔ میری باتیں بن کے جان لینے والا۔ انجانے میں مجھے دکھ دے گیا ہے۔"

میری ساری ذات گھٹیسوں میں الجھ گئی۔

جب حسین نے اپنا راز اس پر آشکار کیا تو اسے ایک سامع کی ضرورت پڑنے لگی۔ میری لافعلی کی بنا پر سحر نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی۔ مگر مجھے ان باتوں میں چٹوٹا دلچسپی نہ تھی۔ تب ہی میں انہیں نظر انداز کرنے لگی۔ مجھے انہیں مسکراتا دیکھ کر وحشت ہوتی

تھی۔ میں نے ان کی محفلوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا۔

اپنی وحشتوں سے گھبرا کر خدا کے سامنے سر بسجود ہو جاتی تو ہاتھ دعا کے لیے پھیل جاتے۔
”اے اللہ! اسے کوئی ایسا غم دے دے کہ وہ دیواروں سے سر کرنا پھرے پر سکون نہ پائے۔ وہ بھی میری طرح ترپے تو جائے کہ ٹھکرائے جانے کی ترپ کیا ہوتی ہے۔“

میری ہر دعا اس کی برپاوی و ناشدہ کی قننا سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہونے لگی۔ جانے کیوں میرے دل کو یقین تھا اس کی ترپ میں میرا سکون پوشیدہ ہے۔ اس روز ہلکی بادش ہو رہی تھی۔ یوں تو میری لا تعلقی کی بنا پر ان دونوں نے مجھے اپنی محفل میں شریک کرنا تقریباً ختم ہی کر دیا تھا مگر اس روز سحر مجھے زبردستی بلغم میں لے آئی۔

”بھئی! ہماری زہر تو لاہور میں ہی رہ گئی۔ یہ والی تو کوئی اور ہی زہر ہے۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ مجھے ٹھوڑی کا زخم پھر یاد آ گیا۔

”مجھے چھوڑو؟“ بھئی کہی ہے تمہاری۔ ”وہ“ کبھی تم نے اس کا نام ہی نہیں بتایا۔ ”سوال خود بخود میرے لبوں سے پھسل گیا۔

”اصل بات یہ ہے زہر وہی! محبت کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ آپ اسے جس مرضی نام سے پکاریں۔“ وہ گہری سانس بھر کر کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ سحر سننے لگی۔

”تمہارے کیا کہہ کر پلاتے ہو؟“
”دوستی۔ تمنا۔ زندگی۔“

اس کے چہرے پر الوہی سی چمک تھی، لہجے میں ٹھنک۔ میری آنکھوں میں دھند پھیلنے لگی۔ تو رخ پھیر کر فوارے کی منڈیر پر دھری ٹنگریاں پانی میں اچھالتے لگی۔

”میں نے اس کے لیے پیام بھجو لیا ہے۔ تم دونوں دعا کرنا کہ وہ راضی ہو جائے۔ کم بخت بہت اڑیل ہے۔“

اس کے لہجے میں شکایت تھی اور محبت کی بے بسی۔

پانی میں ٹنگریاں اچھالتے میں نے چونک کر اسے دیکھا وہ سر جھٹائے جوئے کی ٹو سے نکلاں کھینچ رہا تھا۔ ایک ایک وہ دل گرفتہ دکھائی دیتے لگا تھا۔ میرے لبوں پر اس سبز ایسے مسکراہٹ نکھر گئی۔

”میں نے خود کو اب تک تمہارے حق میں یہ دلیل دی تھی کہ تم میری کیفیت سے انجیل تھے۔ جو ہوا ہے خبری میں ہوا مگر کوئی خود عشق کا لاؤن کر دیکھ رہا ہو اور اسے کسی دوسرے کے راکھ ہو جانے کی خبر تک نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ تم جھولے ہو۔ دھوکے باز ہو۔ جانتے بوجھتے میرے دل کی دنیا اجاڑ کر کہیں اور رنگ نکلیے ہیں تم نے۔ دیکھنا تم بھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ تم اور وہ۔ تمہاری ہوتی سولی۔ اسی آگ میں جل مو گے اور کبھی سکون نہ پاؤ گے۔“

وہ دلی دل پر کو سنوں پر اتر آیا تھا۔

میری عجیب کیفیت تھی۔ ہر وہ چہرہ جو ہنستا مسکراتا دکھائی دیتا وہ گویا میری ہنسی اڑاتا تھا۔ بظاہر میں پر سکون تھی۔ مگر زلت کا احساس میرے اندر زہرین کر پھیل رہا تھا۔ میں سر تپا نفرت جتنی جاری تھی۔



”آپ نے کبھی محبت کی ہے۔ کیا آپ کبھی ٹھکرائے گئے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی خوابوں کی کرچیاں خننے کاغذاب سنا ہے؟“ نہیں نا۔

تو پھر آپ کیا جانتیں کہ میں برہنہ پا کن انگڑوں پر چل رہی تھی۔ ”میرے سامنے ہونا ہنستا مسکراتا“ محبت کے سرو میں گم اور میں۔ خاک ہوئے جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ لا حاصل محبت، عشق ہے اور عشق دیوانگی ہے۔

ترپ ہے۔
پاکل بہن ہے۔
تباہی ہے۔

عشق جانتا ہے کہ کس انسان کو کیسے قابو کرنا ہے۔ کس کے لیے لا تعلقی کا چارہ کافی ہے، کسے بلند مرتبے کی گندی چھانے کی۔ کسے چند روز کی محنت کافی ہے، کس کے پیچھے دلوں کو زنا پڑے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ عشق اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

جیسے شیطان بنی آدم کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے جتنے زہری معمولی معمولی دھوکے دیتا ہے، ٹھیک ویسے ہی عشق بھی انسان کا ایسی دلی کرنا ہے اور جب انسان سوز و غم میں مست ہو جاتا ہے تو اسے ترپنا چھوڑ کر کسی اور سمت چل دیتا ہے۔ نفرت، نفرت کرنے والے کو لٹا کر ہلاک نہیں کرتی جتنا عشق، عشق کرنے والے کو تباہ کر دیتا ہے۔

تو میں تباہ ہو رہی تھی۔ اندر ہی اندر۔ کبھی بھی تو مجھے لگا حسنین اور سحر مجھے جانے کے لیے میرے سامنے اس لڑکی کا ذکر کرتے ہیں۔ جس سے بن ملے میں دیکھے میں نفرت کرنے لگی تھی۔

مجھے سحر سے بھی پڑ ہونے لگی تھی۔ وہ وقاص کا ذکر کرتی اور میرے زخم کو زخم اور زخم کو تکلیف دینے لگتے۔ اس کا ہر ہر لفظ میرے زخموں پر ٹپک پاشی کرتا تھا۔ ارباب زلالہ کے ریل بیٹا ہوا تو حویلی میں میں روز تک جسن منایا گیا۔ پورا خاندان جمع تھا۔ دھول، شائے مندر نیاز جانے کیا کیا ہو رہا تھا۔

”وہ“ یوں خوش خوش پھر رہا تھا جیسے پہلی بار چاچا بنا ہو۔ اونچا لہجہ، بہترین افغان برسیا کرنا، شلووار خوب ڈھکی رہا تھا۔ میں نے منہ پھیر لیا، مگر دلوں میں لپٹنے لگے۔ اس شخص نے خوش خوش اپنا آپ کسی اور کو سونپا تھا۔

جانے ”وہ“ کیسی ہوگی۔؟ خیر جیسی بھی ہوگی۔ ان شاء اللہ کبھی خوش نہ رہ سکے گی۔ اس نے میری خوشیوں کو تہہ و بالا کیا ہے۔ میری بددعا میں مدد اس کے تعاقب میں رہیں گی۔

میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑی سوچ رہی تھی جب باپتی کا پتی سحر چلی آئی۔ جانے حویلی کے کس کو نے پرواقص سے ٹکرا کر آئی تھی۔ اور اب

اپنی اچھل پھل سانسوں کو سنبھالتی مجھے اپنی امیر خن سارہی گئی۔

میں نے آج اس پر رشک نہیں کیا بلکہ دل میں بے اختیار حسد کا جذبہ ابھرا۔ اس کے چہرے کے رنگ میرے دل کو تاریک سے تاریک تر بنا رہے تھے۔ ”زہو! کیا تم مجھ سے خفا ہو؟“ اچانک اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے آکرنا جواب دیا۔ ”پھر؟“ کیا میری کوئی بات بری لگی ہے؟ خود سے تم کوئی بات کرتی نہیں ہو، میں بلاؤں تو سستی ہو، مگر آج ہٹ سے۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟“

(مسکے ہوئے۔ تمہارے پاس وقاص ہے، اس لیے اتنا بڑھ چڑھ کر بول لیتی ہو۔ وہ آج تمہیں چھوڑ دے تو میں بھی تمہیں ترپنا دیکھ کر ایسے ہی سوال پوچھوں گی۔)

”حسنین بھی کہہ رہا تھا کہ زہر بہت بدل گئی ہے۔ پوچھ لیتا، کیس اپنا دل لاہور میں ہی تو نہیں چھوڑ آئی؟“ وہ کتنی جاری تھی۔ میرے لبوں پر لہجہ تازہ مسکراہٹ نکھر گئی۔

(چہ خوب اسے دکھائی دے گیا کہ یہ وجود دل سے خالی ہے۔ اس حسی شخص سے کو میں اپنا دل اس کے پاس چھوڑ سکتی تھی۔ اسی نے میرے دل کو اپنے بیڑوں سے روندنا سے لب بدل جانے کا کیا شکوہ؟)

سحر کی چوڑیوں کی ٹھنک نے مجھے چونکا دیا۔ ٹھنک لٹائی سے دھلی کلائی میں سرخ کالج کی چوڑیاں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

(جب میں خوش نہیں رہ سکتی تو کوئی اور کیوں رہے)

”ایسی بات نہیں ہے سحر! میں کچھ بونہی طبیعت ہو چھل رہی ہے۔ شاید میں ان دلوں کو بہت پس کر رہی ہوں۔ جب ہم ہاسٹل میں تھے۔ یاد ہے کتنی شرارتیں کیا کرتے تھے ہم دونوں۔ خیر چھوڑو۔ تمہاری چوڑیاں بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔“ میں نے جان بوجھ کر اپنی سولی کلائی اس کے سامنے

